بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

دورِ حاضر کے ایک نامور مؤرخ نے مشہور فرمانروا سکندر کے زوال کی داستان بیان کرتے ہوئے جو صورتِ حال پیش کی ہے وہ مطلق العنان فرمانرواؤں کے لیے اپنے اندر عبرت کا کافی سامان رکھتی ہے۔ ہم یہاں اس کے چند اقتباسات نقل کرتے ہیں تاکہ اس آمرانہ طرزِ فکر اور طرزِ عمل کا انجام معلوم ہو سکے۔

"چار سال بعد نوجوان بادشاہ کو اس امر کا احساس ہوا کہ کبریائی کا وہ بلند و بالا مقام جس کا وہ دعویدار ہے اس کے لیے غیر معمولی شان و شوکت درکار ہے۔ اپنی کبریائی کا سکہ چلانے کے لیے اُسے ایسے ٹھاٹھ قائم کرنے چاہییں جن سے لوگوں کے ذہنوں کو مرعوب کیا جا سکے۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لیے اُس نے اپنے ہاں یہ طریقہ رائج کیا کہ جو شخص بھی اُس کی بارگاہ میں حاضر ہو وہ سب سے پہلے اس کے حضور میں سرِ تسلیم خم کرے اور پھر اس کے پاؤں کو بوسہ دے۔ اس نے تمام بڑے بڑے شہروں اور قصبات میں یہ فرمان جاری کیا کہ ہر شہر اور قصبہ میں دیوتاؤں کے جو بُت نصب ہیں ان میں اس کے بت کا بھی اضافہ کر دیا جاتے اور اس کے سامنے بھی اُسی طرح نذر و نیاز پیش کی جاتے جس طرح کہ دوسرے بتوں کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔ یہ ہے وہ طریق جس سے سکندر نے یورپ کے اندر مطلق العنانیت اور شہنشاہوں کے حقوقِ آسمانی کو رواج دیا۔

شاہ پرستی کے اس رجحان نے عوام کے دلوں میں مختلف قسم کے شکوک و شبہات پیدا کیے اور اس سے وہ حلقے بھی بدظن ہونے لگے جنہیں بادشاہ کا قرب حاصل تھا۔

اس کے نتائج ملک و قوم اور خود بادشاہ کے لیے انتہائی مہلک ثابت ہوئے۔ وہ لوگ جو کبھی اُس کے دمساز اور دلسوز فدائی تھے وہ اس کی جان کے دشمن بن گئے اور ہر طرف سازشوں کا جال بچھ گیا۔ سکندر نے اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے ان باغیوں کے خلاف مقدمات قائم کیے اور انہیں عبرتناک سزائیں دلوائیں۔

بادشاہ اور اس کے درباریوں کے درمیان یہ تلخی اس حد تک بڑھتی چلی گئی کہ خود بادشاہ کے محافظ تک بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ایک محافظ جس پر بادشاہ کو بے حد اعتماد تھا اُس نے ایک ضیافت میں سکندر کے سامنے اس کے آمرانہ طرزِ عمل کے خلاف لب کشائی کی۔ سکندر یہ تنقید سُن کر سخت برہم ہوا اور اس نے ایک بھالا اٹھا کر اُس شخص پر بھرپور وار کیا۔ وہ بیچارا زخموں کی تاب نہ لا کر دنیا سے رخصت ہو گیا۔ یہ شخص سکندر کا انتہائی مخلص بہی خواہ اور سچا خادم تھا۔ اس نے نہایت پُرآشوب حالات میں اس کی حفاظت اور پاسبانی کا فرض ادا کیا اور اُس کی جان کو کئی مرتبہ اپنی جان خطرے میں ڈال کر بچانے کے لیے کوشش کی۔

بادشاہ پر جب ذرا جنون کی کیفیت کم ہوئی تو اُسے اپنی حماقت کا احساس ہوا کہ اس نے اپنے ایک جاں نثار کو ایک ہیجان کے تحت قتل کر ڈالا ہے۔ وہ تین دن تک ساکت و صامت، بغیر کچھ کھاتے پیئے کھڑا رہا۔ اگر بعض حکام اُس کے ارادے میں حائل نہ ہوتے تو وہ ضرور خودکشی کر لیتا۔

یہ تھا وہ طرزِ عمل جس نے بادشاہ کے وقار کو بالکل ختم کر کے (اُسے) برباد کر کے رکھ دیا۔ اس عاقبت نااندیشانہ پالیسی کی وجہ سے اُس نے ہر طبقے کے اندر اپنے خون کے پیاسے پیدا کر لیے اور اس طرح اس کی زندگی انتہائی غیر محفوظ اور تلخ بن کر رہ گئی۔

یہ طویل اقتباسات بظاہر سکندر کے حسرتناک انجام کی داستان بیان کر رہے ہیں لیکن

ان کے اندر ہر آمر کی نفسیاتی کیفیات، اس کے ناپاک عزائم، اس کا جبر و استبداد اور بالآخر اُس کا حشر دیکھا جا سکتا ہے۔ دُنیا کے تمام وہ سر پھرے جن کے دماغوں میں غیر مسئول اقتدار کا سودا سمایا ہُوا تھا انہوں نے زمان و مکان کے اختلاف کے باوجود بالکل اسی قسم کی حماقتیں کیں جن کا سکندر مرتکب ہُوا تھا اور وہ اُسی عبرتناک انجام کو پہنچے جس پر مقدونیہ کے اس کم فہم فرمانروا کی زندگی ختم ہوئی۔ سیزر، نپولین، ہٹلر، مسولینی، سٹالن اور اسی طرح کے سارے لوگ جنہیں ہوسِ اقتدار نے اندھا کر رکھا تھا بڑے طنطنے کے ساتھ دنیا کے سینے پر اُبھرے، فوج اور پولیس کی قوت سے لوگوں پر اپنا تسلط قائم کیا، ہر اُس آواز کو دبانے کی کوشش کی جو اُن کے نزدیک کسی لحاظ سے بھی خطرے کا باعث بن سکتی تھی، جس جس شخص یا گروہ کو انہوں نے اپنے اقتدار کی راہ میں حائل پایا اُسے ختم کر دیا، یا مختلف ہتھکنڈوں سے اُسے بے اثر بنانے کی سعی کی اور اس طرح پورے ملک میں اپنے حق میں ایسی فضا ہموار کرنے کی سازشیں کیں، جس میں سوائے آمر کی ایک قیمتی ذات کے کسی اور شخص کی کوئی اہمیت باقی نہ رہے۔ وہ اکیلا لوگوں کی توجہ کا مرکز اور اُن کی محبت کا محور ہو۔ عوام صرف اُسی ایک کی مدح و ستائش میں رطب اللسان رہیں۔ تنہا اُسی کی ذات پر لوگوں کو اعتماد اور بھروسہ ہو جسے وہ صحیح اور برحق کہہ دے لوگ اُسے بلا تامل حق تسلیم کر لیں اور جس چیز کے بارے میں اُس کی زبان فیض ترجمان باطل کا فتویٰ صادر فرما دے پُوری قوم اُسے دل کی گہرائیوں سے باطل سمجھنے لگے، اُس کی رائے ملک کا قانون اور اُس کے فیصلے اُس کے نظامِ حیات کی اساس ہوں۔

دنیا کے ہر آمر نے اس غیر مسئول اقتدار کا کچھ مدت کے لیے لُطف ضرور اٹھایا لیکن "انا و لاغیری" کا یہی جذبہ بالآخر اُس کی بربادی کا ذریعہ بنا اور تاریخ کے وہ اوراق جن میں کبھی اُس کے کارنامے جلی حروف سے لکھے جاتے تھے وہ اُس کی تباہی کی عبرتناک داستانیں بیان کرنے لگے۔ فوج اور پولیس کی کوئی زیادہ سے زیادہ تعداد مال و متاع کی کوئی زیادہ سے زیادہ مقدار جاہ و جلال

کی کوئی اونچی سے اونچی سطح بھی اُس کے حسرتناک انجام کو روک نہ سکی اور وہ جس حیرت انگیز سرعت کے ساتھ مسندِ اقتدار پر قابض ہوا۔ اُس سے کہیں زیادہ حیرت انگیز سرعت کے ساتھ اُس سے بے دخل بھی کیا گیا اور اس اکھاڑ پچھاڑ میں نہ صرف خود ناقابلِ تلافی نقصان اٹھایا بلکہ قوم اور ملک کو ایسے مصائب میں گرفتار کر گیا جنہوں نے اُن کی کمر توڑ کر رکھ دی۔

دنیا کے بدنصیب آمروں کا قریب قریب ایک سا حشر دیکھ کر انسان کی عقل یہ باور نہیں کر سکتی کہ یہ سب کچھ محض بخت و اتفاق کا نتیجہ ہے۔ زمان و مکان کے وسیع اختلاف کے باوجود اس جابرانہ نظام کا ایک ہی طرح کا انجام اس حقیقت کی واضح غمازی کرتا ہے کہ اس کے بطن میں بعض ایسے فاسد مادے پائے جاتے ہیں جن کی وجہ سے ایک ہی نوعیت کا بگاڑ رونما ہوتا ہے۔ ان صفحات میں آج ہم انہیں مفاسد کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔

اس نظام کا سب سے بڑا سقم یہ ہے کہ یہ انسانی فطرت کے خلاف ایک کھلی بغاوت ہے۔ دنیا کے تمام انسان ایک ہی باپ کی اولاد ہیں اس لیے شرفِ انسانیت کے اعتبار سے کسی ایک کو دوسرے پر کوئی فوقیت حاصل نہیں۔ ان کے درمیان شریف و کمین کی جو تفریق کی گئی ہے وہ بالکل مصنوعی ہے بلکہ یہ ایک سازش ہے جو انسانیت کے بدخواہ نوعِ بشری کے خلاف وقتاً فوقتاً کرتے رہے ہیں۔ انسان جسے خود اللہ تعالیٰ نے انسانیت کا تاج پہنا کر دنیا میں بھیجا ہے، وہ آخر ذلت اور خواری کے اس پست مقام پر آنا کیونکر گوارا کر سکتا ہے کہ سوچنے اور سمجھنے، اور غور و فکر کرنے کے بنیادی حق سے خود بخود دست بردار ہو جاتے اور اندھی بہری قوت کے خوف سے "چوپایوں" کی سطح پر رہنا گوارا کرلے اس کی نظر میں شرفِ انسانیت سے محرومی اُس کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ چنانچہ جب بھی بعض چالاک اور عیّار لوگوں نے اُس کے اس بنیادی حق پر ہاتھ ڈالا تو اُس کی طبیعت کے اندر شدید قسم کا ردِّ عمل پیدا ہوا اور اُس نے پوری قوت کے ساتھ اپنے اس حق کی حفاظت اور پاسبانی کی۔ آپ تاریخ پر ایک نگاہ ڈالیے تو

آپ کو معلوم ہوگا کہ انسان نے اپنا سب سے زیادہ سرمایۂ حیات اسی قیمتی جوہر کو بچانے میں صرف کیا ہے۔ اس جابرانہ نظام کی تائید کے لیے دنیا میں عجیب وغریب نظریے گھڑے گئے، ان میں سے بعض نظریے بڑے خوش کن اور دلفریب بھی تھے لیکن انسان نے ان پر ایمان لانے سے ہمیشہ گریز کیا۔ اس کی فطرت کبھی یہ تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوئی کہ خداوند تعالیٰ نے اُسے فہم وادراک کی جو بیش بہا قوتیں بخشی ہیں انہیں صرف ایک شخص کی خوشنودی کی خاطر تیاگ دیا جائے اور بھیڑوں کے ایک گلے کی حیثیت اختیار کر لی جائے جسے آمر کی قوت جس طرف چاہے بالکل میکانکی طور پر ہانک کر لے جائے۔

آپ اس نظام کی ہیئتِ ترکیبی، اس کے طریقِ انقلاب اور اس کے نتائج کا اگر تجزیہ کریں تو آپ پر یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو جائے گی کہ اس کا کوئی جزو بھی ایسا نہیں جو کسی اعتبار سے بھی فطرت سے ہم آہنگ ہو۔

آپ سب سے پہلے اس کی ہیئتِ ترکیبی کو دیکھیں۔ اندھی بہری قوت اس نظام کے اندر غالب عُنصر کی حیثیت سے شامل ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ جبر و استبداد ہی اس نظام کا مبداء اور جوہرِ حیات ہے تو یہ زیادہ صحیح ہوگا۔ حصولِ قوت کی بڑھتی ہوئی ہوس اس کے قیام کا محرک ہوتی ہے، پھر اسی کے بل بوتے پر یہ قائم ہوتا ہے، یہی اسے آگے لیکر بڑھتی ہے اور اسی کے سہارے یہ کچھ دیر تک دنیا میں پھلتا پھولتا ہے۔ جس قوم یا ملک پر اس کا تسلط ہو وہاں فکر و نظر، فہم و فراست سب کے سب اسی کے تابع ہوتے ہیں۔

عقل و شعور اور ضمیر و وجدان کی جگہ بے حس قوت کو رہنما بنا لینا انسانیت کے حق میں انتہائی مہلک اور خطرناک ہے۔ قوت بلا شبہ اپنے اندر افادیت کے کئی ---- پہلو رکھتی ہے لیکن یہ اُسی صورت میں کسی خیر اور بھلائی کا ذریعہ بن سکتی ہے جب یہ کسی بہتر اخلاقی نظام کے تحت اپنا فرض سرانجام دے اور جہاں یہ خود ہی اخلاقی ضابطوں کی تشکیل کرنے لگے وہاں انسانیت

کا بالکل جنازہ نکل جاتا ہے۔

کسی فرد یا گروہ یا پوری دنیا کے انسانوں کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ خود اپنی فکری صلاحیتوں سے کوئی ایسا ضابطۂ اخلاق تیار کرسکیں جس میں انسان کے سارے داعیات کے ساتھ عدل و انصاف کیا جاسکے۔ انسانی اعمال کے محرکات اور اُن کی نوعیتیں اس قدر پیچیدہ اور اُلجھی ہوئی ہوتی ہیں کہ انہیں علم کیمیا کی طرح سادہ اجزا میں تحلیل نہیں کیا جاسکتا۔ ان میں ربط و ترتیب اُسی صورت میں قائم کرنی ممکن ہے جب اُن کے احوال و اسباب کے سلسلے کا بڑی بے لوثی کے ساتھ ہر زاویۂ نگاہ سے پوری طرح گہرائی میں اُتر کر نفسیاتی جائزہ لیا جاسکے۔ ایک ذہین سے ذہین انسان جسے اپنے جذبات پر پُورا پُورا اختیار ہو اور جو فہم و بصیرت کی دولت سے بھی پوری طرح مالا مال ہو، وہ بھی اس فرض کو کامیابی کے ساتھ سرانجام نہیں دے سکتا۔ درحقیقت انسان کے اندر اس قسم کی بے لوثی کبھی پیدا ہی نہیں ہوسکتی۔ وہ اپنی فطرت کے اعتبار سے مجبور ہے کہ کسی ایک طرف جھک جائے۔ اس کے جذبات، اس کے معتقدات، اُس کے ذاتی رجحانات اور میلانات اور گردو پیش کے حالات اور اسی طرح کے بہت سے دوسرے خارجی اور داخلی عوامل اُس کے فیصلوں پر شعوری اور غیر شعوری طور پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔

دستورِ حیات کی تشکیل جیسے اہم اور نازک کام کو، جس کی بجا آوری کے لیے عقل سراسر عاجز ہے، بپھری ہوئی قوت کے سپرد کردینا، انتہائی ظلم اور زیادتی ہے اور اس سے جس قسم کے نتائج برآمد ہوسکتے ہیں اُن کا بھی بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

آئیے اب ایک نگاہ آمریت کے طریقِ انقلاب پر بھی ڈال لیں۔ انقلاب کا فطری طریق یہ ہے کہ آپ جن اصول و نظریات کو صحیح اور درست سمجھتے ہیں سب سے پہلے اُن کی برتری کا نقش لوگوں کے دل و دماغ پر بٹھا دیجیے اور انہیں اس بات کا قائل کیجیے کہ اُن کی فلاح و کامرانی انہیں افکار و تصورات

اپنانے میں مضمر ہے۔ کوئی صحیح انقلاب اس وقت تک برپا نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ انسانوں کی عظیم اکثریت کے اندر فکر و نظر کی تبدیلی نہ پیدا ہو چکی ہو۔ قلب و نگاہ کی تبدیلی بالآخر خارجی حالات کے اندر تغیر و تبدل کی متقاضی ہوتی ہے جس کی وجہ سے لوگوں کے اندر موجودہ صورت حال سے عدم اطمینان اور نئے حالات پیدا کرنے کے لیے شدید احساس اُبھرتا ہے جو بالآخر ایک ہمہ گیر تحریک کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور اس طرح ایک نظام کی جگہ دنیا میں دوسرا نظام قائم ہو جاتا ہے۔

انقلاب کے اس صحیح اور سیدھے طریق کے برعکس آمریت کے علمبردار ایک دوسرا راستہ اختیار کرتے ہیں، جو فطرت کی عین ضد ہے۔ لوگوں کے دل و دماغ میں کسی نظریہ اور اصول کی برتری قائم کر کے انہیں اُس کے نفاذ کے لیے عملی جدوجہد پہ اُبھارنے کی بجائے یہاں سارا کاروبار سازشوں کے ذریعہ چلتا ہے۔ ایک فرد یا مختصر سا گروہ ملک کے اندر بالکل ڈرامائی انداز میں سر اٹھاتا ہے اور پھر بڑی چالاکی اور عیاری کے ساتھ فوج اور پولیس کی مدد سے عوام کی گردنوں پر مسلط ہو جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یُوں کہہ سکتے ہیں کہ اسے داخلی انقلاب سے پہلے خارجی انقلاب برپا کرنے کی فکر دامن گیر ہوتی ہے سا سے اس بات سے کوئی سروکار نہیں ہوتا کہ لوگوں کے قلب و نگاہ کے زاویے بدلیں، اور اُن کا احساس و شعور اس تبدیلی کے لیے تیار ہو۔ دراصل کوئی فکری انقلاب سرے سے اُس کے پیشِ نظر ہوتا ہی نہیں۔ وہ صرف اقتدار کا خواہاں ہوتا ہے اور اسے ہر جائز و ناجائز طریق سے حاصل کرنے کا آرزومند رہتا ہے۔ اُس کی طاقت کا سرچشمہ عوام کی تائید نہیں ہوتی بلکہ فوج، پولیس اور اسی طرح کے دوسرے انتظامی اداروں کی قوت ہوتی ہے۔ وہ لوگوں کو اپنے افکار و نظریات کا گرویدہ بنانے کی بجائے اُن پر اپنی طاقت کا رُعب جماتا ہے تاکہ وہ کبھی سر اٹھانے کی جسارت نہ کریں، وہ رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار نہیں کرتا بلکہ اس کا گلا گھونٹنے کی فکر کرتا ہے

دنیا کا جو نظام سازشوں، چالبازیوں اور اندھی بہری طاقتوں کے بل بوتے پر قائم ہوگا اُسے چلانے کے لیے بھی لامحالہ اسی قسم کے اخلاق سوز حربے استعمال کرنے پڑیں گے۔ اس نظام کا ہر علمبردار احساس کہتری کا شکار ہوتا ہے وہ اس حقیقت کو اچھی طرح جانتا ہے کہ کاسہ لیسوں کا گروہ اُس کی مدح و ستائش میں جو چاہے کہتا رہے لیکن لوگوں کے دلوں میں اس کے لیے کوئی جذبۂ احترام موجود نہیں۔ جو شخص عوام کی آزادی پر شبخون مار کر ان کی گردنوں پر سوار ہو اور پھر انہیں جانور سمجھ کر اُن سے معاملہ کرے، اُس کے لیے کسی دل میں عزت کا مقام کس طرح پیدا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ کسی آمر کو عوام پر کبھی اعتماد نہیں ہوتا اور دوسری طرف عوام بھی آمر سے ہمیشہ بدگمان رہتے ہیں۔ بے اعتمادی کی اس فضا میں فرمانروا اور رعایا دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف مختلف قسم کے شکوک و شبہات کا پرورش پانا بالکل ایک فطری امر ہے۔ حکمراں یہ سمجھتا ہے کہ یہ لوگ جن پر وہ حکمرانی کر رہا ہے اُس کے خون کے پیاسے ہیں اور عوام اسے اپنا سب سے بڑا دشمن خیال کرتے ہیں۔ اس لیے ہر ایک دوسرے سے خوف اور خطرہ محسوس کرتا ہے۔

جس شخص کے ذہن میں ہر وقت خوف کے جراثیم پلتے رہیں اور جس کے دل میں ہر آن بدگمانی راہ پاتی رہے وہ جلد ہی پاگلوں کی سطح پر اُتر آتا ہے۔

اس پاگل پن کی پہلی علامت یہ ہے کہ وہ پُر اسرار زندگی بسر کرنا شروع کرتا ہے۔ اُس کے افکار و نظریات اُس کے معتقدات و تصورات اور اُس کے افعال و اعمال سب کے اندر ایک جنون کی کیفیت دکھائی دیتی ہے۔ ہٹلر کی گھریلو زندگی کا جو نقشہ اُس کے سوانح نگاروں نے کھینچا ہے اُس سے اِس پُر اسرار زندگی کا ہلکا سا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اُس کے محل کے اندر ایک خادم کو جب ملازم رکھا گیا تو اُسے مندرجۂ ذیل ہدایات جاری ہوئیں۔

" میں اس قصر میں جو کچھ دیکھتی ہوں، اُس کا اپنے رفقاء سے بھی کبھی تذکرہ نہ کرونگی۔ سیاست کے متعلق ایک حرف بھی زبان پر لانا شدید جرم ہے۔ اس ایوان کے جس حصے

میں جانے کی مجھے اجازت نہیں، اُس کی طرف مجھے کبھی بھولے سے بھی نگاہ نہ ڈالنی چاہیے۔ یہاں کسی کو خط لکھنا یا اپنی ڈائری رکھنا سنگین نوعیت کا جرم ہے۔ میرا یہ فرض ہے کہ میں تین تین گھنٹے کے بعد اپنے افسرِ اعلیٰ کو اپنی موجودگی اور کارکردگی کی اطلاع دوں۔ ساڑھے نو بجے رات سے پہلے مجھے کمرے کی تمام بتیاں گل کرکے لازمی طور پر سو جانا چاہیے۔ یہاں سیٹی بجانا بھی منع ہے کیونکہ ہٹلر کو اس سے سخت نفرت ہے۔ باغ کی طرف جاتے ہوئے مجھے کم از کم چار ملازمین کو اپنے ساتھ لے جانا چاہیے۔ ہٹلر اگر مجھ سے خود مخاطب ہو تو مجھے بڑی عاجزی اور انکساری سے اُس کا جواب دینا چاہیے لیکن مجھے یہ حق حاصل نہیں کہ شدید سے شدید ضرورت کے تحت بھی اُس کی بارگاہِ اقدس میں کوئی گذارش کرسکوں"[1]

آپ اس بدنصیب خاتون کی اس حالتِ زار کو ذرا دیکھیے اور خود سوچیے کہ اس بیچاری کو ہٹلر کے محل کے اندر کس قسم کی ذہنی اذیت برداشت کرنا پڑی ہوگی۔ جس ذی شعور انسان کے فکر و نگاہ پر سنگین پہرے بٹھا دیئے جائیں اُس کی زندگی موت سے بدتر ہو جاتی ہے۔ کسی حساس شخص کے لیے یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ محل کے اندر مظالم کے روح فرسا واقعات دیکھے مگر اُس کی طبیعت اُن کے اظہار پر آمادہ نہ ہو۔ وہ اپنے رفقاءِ کار سے جن کے ساتھ وہ صبح و شام زندگی بسر کر رہا ہے بالکل بے تعلق ہو کر رہ جائے، خفیہ پولیس ہر وقت سائے کی طرح اس کا پیچھا کرتی رہے اور اسے ہر وقت یہ خطرہ لاحق رہے کہ اب میری زندگی کا چراغ گل ہوا۔ اپنے گردوپیش سے اتنی غیر معمولی بے تعلقی تو صرف ایک لاش ہی سے ممکن ہے۔ انسان کے اندر جب تک جان موجود ہے، وہ جب تک فکر و احساس کی ساری قوتوں اور صلاحیتوں سے یکسر محروم نہیں ہو جاتا، اُس کے لیے بے حسی کی اس حالت کو قبول کرنا سب سے بڑا عذاب ہے۔

پھر آمریت کا پورا انتظام خفیہ پولیس کی ناپاک سرگرمیوں کے ذریعہ چلتا ہے۔ وہاں آزاد

[1] "میں ہٹلر کی خادمہ تھی" از قاریین ص ۱۲

ممالک کی طرح کارِ خاص کا یہ منصب نہیں کہ وہ حکمرانوں کو عوامی احساسات وجذبات سے روشناس کرائے اور ان کے اندر جو خفیہ جرائم پرورش پا رہے ہوں، اُن کا کھوج لگانے میں انتظامیہ کا ہاتھ بٹاتے۔ آمریت کے تحت خفیہ پولیس کے جو دستے تیار کیے جاتے ہیں اُن کا سب سے بڑا فرض یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کے اندر مستقل خوف وہراس پیدا کرتے رہیں اور ان کے دل و دماغ میں یہ احساس ابھارتے رہیں۔

کہ اُن کی زندگی صرف اُن کے حکمراں کی چشمِ التفات کی رہینِ منت ہے۔ اگر اس کا ماتھا ذرا بھی شکن آلود ہو گیا تو پھر دنیا کی کوئی قوت اُن کی زندگی کی حفاظت نہیں کر سکتی۔ لوگوں کو اپنی جان کے جس طرح ہر وقت لالے پڑے رہتے ہیں اُس کا اندازہ کرنے کے لیے ہٹلر کی اسی بدنصیب خادمہ کی آپ بیتی ملاحظہ فرمائیں۔

"میں ایک لانڈری کے اندر ایک قمیص استری کر رہی تھی کہ ہٹلر وہاں آدھمکا۔ اس نے میری طرف گھور کر دیکھا اور چلا گیا۔ اس واقعہ کے دس دن بعد میری شادی ہوئی اور میں اور میرا رفیقِ حیات برلن منتقل ہو گئے۔ مجھے اچانک اپنی امی کی طرف سے یہ تار موصول ہوا کہ میرا باپ گرفتار ہو گیا ہے۔ وہ مزدور یونین کا ایک پُرجوش کارکن تھا جب میں اپنے گھر واپس آئی تو میں نے اپنے باپ کی رہائش گاہ کو بالکل خالی پایا۔ میرے پڑوسی نے مجھے بتایا کہ خفیہ پولیس میری ماں کو بھی گرفتار کر کے لے گئی ہے۔ اس کے بعد مجھے آج تک اُن کی کوئی خبر نہیں ملی۔

اس حادثہ سے مجھے بے حد صدمہ ہوا لیکن میری قسمت میں ابھی مزید بربادیاں تھیں۔ میرا خاوند ایک کارخانے میں ملازم تھا اور وہاں اس کا ایک حاسد نائب اُس کی جگہ حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا، اس لیے اُس نے خفیہ پولیس کے اندھے جوش سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ معلوم نہیں اس بدخصلت آدمی نے کارِ خاص کے عملے کو کیا کہا کہ وہ آدھی رات کے وقت ہمارے مکان پر آ گئے۔ انہوں نے میرے خاوند کو بستر سے گھسیٹا اور

ایک کار میں ڈال کر کسی نامعلوم مقام پر لے گئے۔ میں نے اپنے رفیقِ حیات کو آخری مرتبہ دیکھا اور اس کے بعد اُس کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ شادی کے بعد صرف دو ہفتوں کے اندر میں اپنے ماں باپ اور خاوند سے ہاتھ دھو بیٹھی۔"

یہ ہے بے یقینی کی وہ افسوسناک حالت جس کے اندر ہر شخص اپنے آپ کو گرفتار پاتا ہے۔

جس حکمراں کو اس بات کا یقین ہو کہ وہ عوامی تائید سے محروم ہے اور محض قوت کے ذریعہ لوگوں پر حکمرانی کر رہا ہے، وہ اپنی ساکھ اور برتری قائم کرنے کے لیے نہایت اوچھے ہتھیار استعمال کرتا ہے۔ اس کے اندر اس بات کی زبردست خواہش پیدا ہوتی ہے کہ وہ کسی طرح غیر معمولی انسان کی حیثیت سے اپنے آپ کو لوگوں میں روشناس کرائے تاکہ عوام اس کے فکر و عمل کی "بے پناہ قوتوں" سے مرعوب ہو کر اُسے دل و جان سے اپنا واحد نجات دہندہ تسلیم کرلیں اور اُن کے اندر یہ احساس اُبھرنے لگے کہ اس شخص نے گو اُن کی آزادی سلب کر لی ہے لیکن اس وقت کوئی دوسرا شخص ان کی رہنمائی کا فرض اس سے بہتر طور پر سر انجام نہیں دے سکتا۔ قوم اور ملک کو درحقیقت اسی "گوہر نایاب" کی تلاش تھی اور ملک کی بھلائی اسی میں تھی کہ اس "واحد نجات دہندہ" کا بہت پہلے پتہ لگا کر اسے قوم کے سیاہ و سپید کا مالک بنا دیا جاتا۔ اس معاملے میں قوم سے جو تاخیر ہوئی ہے وہ ناقابلِ معافی جُرم ہے اور اب جبکہ قوم کے اس غم خوار نے محض فرض کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے عنانِ اقتدار سنبھال لی ہے تو اس کے ہر فرد کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اس "نجات دہندہ" کی ہر بات کو منزل من اللہ سمجھ کر اُس کی بلا تامل تائید کرے۔

دنیا کے ہر آمر نے ملت کے درد میں بیتاب ہو کر ہی اُس کی آزادی پر ہاتھ ڈالا اور اس کا غم خوار بن کر اُس کے دل و دماغ میں جنون کی کیفیت پیدا کر دی۔

غیر معمولی ہیجان، اندھا جوش اور بپھری ہوئی قوت، ان تین عناصر سے آمریت کا خمیر اٹھایا

جاتا ہے۔ اس میں اس امر کا خاص اہتمام ہوتا ہے کہ لوگوں کی عقل مفلوج ہو اور اس کی جگہ جذبات کے اندر زیادہ سے زیادہ شدت پیدا ہوتی رہے۔ چنانچہ اس کے سربراہ اس بات کا پورا پورا التزام کرتے ہیں کہ کسی طرح لوگوں کے فکری جہاز بے لنگر رہیں تاکہ جذبات کے تھپیڑے انہیں جس طرف چاہیں بہا کرلے جائیں۔ ریاست کا پورا نظام اور اجتماعی زندگی کے سارے کارخانے جذبات کی حرارت سے چلتے ہیں۔ عقلمند اور معتدل مزاج انسانوں کی یہاں کوئی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔ دانشمند مدبرین اور دماغی توازن قائم رکھنے والے کارکن اس نظام میں کسی طرح کھپ نہیں سکتے۔ یہاں ان لوگوں کی عزت و توقیر ہوتی ہے جنہیں عقل سے بُعد اور جذبات سے محبت ہو، جو لاف زنی میں خاص ملکہ رکھتے ہوں، جو زبان کے معاملے میں مطلق العنان ہوں اور اپنے عمل کی کمی کو ہوائی قلعے تعمیر کرکے پُورا کرنے کی کوشش کریں، جو قوم کو سستے نعروں کی افیون کھلا کر اسے اتنا بدمست کردیں کہ اُس کے اندر اپنے طرزِ عمل کے دُور رس نتائج سوچنے کی کوئی صلاحیت باقی نہ رہے۔ پروفیسر میلوین ریڈر نے اپنی تصنیف "مصالحتِ ناممکن" کے ایک باب "ذہنیت سے فرار" میں بڑی تفصیل کے ساتھ اس بات کا تذکرہ کیا ہے کہ کس طرح فسطائی فلسفہ لوگوں کو ٹھوس حقائق سے ہٹا کر انہیں خواب و خیال کی دنیا میں لا بساتا ہے اور اسے اپنا کر عوام ایسے طلسم میں گرفتار ہو جاتے ہیں جس کے زیرِ اثر وہ بصارت کے باوجود، قوتِ سماعت کے ہوتے ہوتے بھی دیکھ نہیں پاتے کچھ سُن نہیں سکتے، اور قلب و دماغ کے ہوتے ہوئے بھی احساس اور عقل سے یکسر کورے رہتے ہیں۔ اُن کی زندگی کا صرف ایک ہی مقصد ہوتا ہے کہ بالکل آنکھیں بند کرکے حکمران گروہ کے اشاروں پر چلتے چلے جائیں۔ اس سلسلہ میں مسولینی کی درج ذیل عبارت قابلِ غور ہے:

"وہاں بڑی ہی گرما گرم بحثیں ہوئیں۔ لیکن آخر کونسی چیز زیادہ اہم اور مقدس تھی۔ صرف یہ کہ انسان موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ وہ مرنا جانتے تھے۔ ہمارے پاس نظریہ اور فکر کی کمی ہے مگر اس کی جگہ ہم ایک اور مؤثر چیز رکھتے ہیں وہ ہے

اعتقاد[1]"

مسولینی کا سرکاری سوانح نگار اپنے ہیرو کی ذہنی کیفیات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ عظیم انسان صرف جذبات کے بل بوتے پر کام کرنا جانتا تھا۔ کوئی عقلی دلیل، کوئی علمی مشورہ اُسے قبول نہ ہوتا۔ اُس کے ہاں صرف انہی انسانوں کی قدر تھی جو اُس کے منہ سے نکلی ہوئی ہر بات کو بلا تامل سُنتے اور پھر بغیر کسی پس و پیش کے اُس پر عمل کرتے۔ بلکہ دنیا کی ساری حقیقتوں کو اس کی خواہشات کے مطابق ڈھالنے ہی میں اپنی سب سے بڑی سعادت خیال کرتے۔ یہ آمر اپنی فکری قوتوں سے کام لینا کچھ زیادہ پسندیدہ نہ سمجھتا بلکہ محض اپنے جبلّی داعیات کی انگیخت پر لائحہ عمل تیار کرتا چلا جاتا تھا چنانچہ وہ لکھتا ہے:

"میرا خون میری رہنمائی کرتا ہے، میں اپنے خون کی آواز سنتا ہوں"۔

یہ ہیں وہ نعرے جن سے یہ سیاستدان اپنے مسائل حل کرتا تھا۔ وہ اس امر کا برملا اعلان کرتا کہ وہ ایک جانور ہے۔ پیش آمدہ حالات و واقعات کا وہ ادراک کرنے سے قاصر تھا۔ وہ انہیں صرف محسوس کرتا۔ اُسے اس کی جبلّت ان کے متعلق معلومات بہم پہنچاتی اور وہ اس کی اطاعت کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا۔ اُس کی زبان سے بارہا یہ سنائی دیا:

"ہم نے اپنا پیکرِ خیال تخلیق کر لیا ہے اور یہ ہمارا اعتقاد اور جذبہ ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ حقیقت بھی ہو۔ اس کی اصلیت صرف اسی قدر ہے کہ یہ ہمیں سرگرمِ عمل رکھتا ہے"۔

غالبًا یہ جذبات کی اسی حکمرانی کا کرشمہ ہے کہ آمریت ہمیشہ غیر معقول، مگر بڑے نمائشی طریقوں سے اپنا راستہ ہموار کرتی ہے۔ قوم کے سامنے کوئی ٹھوس پروگرام پیش نہیں کیا جاتا بلکہ اُس کے ہاتھ میں خوش کُن اصلاحات کے رنگین غبارے دے دیئے جاتے ہیں تاکہ وہ ان سے

[1] یہاں اعتقاد سے مراد صرف اندھا دھند جوش اور جذبہ ہی ہے۔

کھیل کر اپنا دل بہلا سکے۔ آمریت کے تحت کام بڑے زور شور سے ہوتا دکھائی دیتا ہے اور بظاہر یوں نظر آتا ہے کہ سارے ملک کے اندر غیر معمولی ترقی ہو رہی ہے لیکن ان سرگرمیوں کے کوئی ٹھوس نتائج برآمد نہیں ہونے پاتے اور انسان جب بھی اس حیرت انگیز "تگ ودو" کے ثمرات پر غور کرتا ہے تو اسے ان کی حیثیت کسی طرح دیوانے کے خواب سے زیادہ معلوم نہیں ہوتی۔

آمریت کا یوں تو پورا دور ہی بربادی کا دور ہوتا ہے لیکن اس کا انجام خاص طور پر بڑا وحشتناک ہوتا ہے۔ آمر کے ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کر بعض دوسرے من چلوں کے منہ میں بھی پانی بھر آتا ہے اور وہ بھی قسمت آزمائی کے لیے مختلف قسم کی سازشیں شروع کر دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پورے ملک کے اندر انتشار اور بدامنی شروع ہو جاتی ہے آمر کی گرفت آغاز میں قدرے مضبوط ہوتی ہے لیکن اسے اپنی طاقت کو قائم رکھنے کے لیے بعض شخصیتوں کو بڑی ہی ناجائز قسم کی مراعات دینی پڑتی ہیں اور اس طرح انتظامیہ جو آمر کا سب سے بڑا سہارا ہوتی ہے وہ بھی آہستہ آہستہ کمزور پڑ جاتی ہے۔ دوسری طرف عوام کے اندر بڑی سرعت کے ساتھ بددلی پھیلنے لگتی ہے۔ کچھ مدت تک تو جذبات کے زیر اثر وہ خاموش رہتے ہیں لیکن جلد ہی ان کے اندر بیداری آجاتی ہے اور وہ آمر کی کارگزاریوں کو فہم و فراست کی معتدل میزان پر تول کر دیکھنا شروع کرتے ہیں۔ انہیں اس چیز کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ ملک و ملت کی فلاح کے نام پر ایک شرمناک کھیل کھیلا گیا ہے، کامرانی کے پردے میں ان کی آزادی لٹی ہے اور اس کے بدلے میں صرف ایک شخص کی کبریائی قائم ہونے کے علاوہ قوم کو کوئی نفع حاصل نہیں ہوا۔

کسی قوم کے اندر جب اس قسم کے احساسات پرورش پانے لگیں تو پھر پوری قوم یاس و قنوطیت کا شکار ہو جاتی ہے۔ یہ مرض قوموں کے لیے ہمیشہ جان لیوا ثابت ہوا ہے۔

اس سے اُن کی صلاحیتیں مفلوج اور اُن کے عزائم اور ارادے مضمحل ہوتے ہیں۔ یہ افسوسناک صورتِ حال کسی وقتی اضمحلال کا اظہار نہیں ہوتی بلکہ بربادی کا پیغام ہوتی ہے۔ آمر کے زوال کے بعد دنیا کی شاید ہی کسی قوم پر اقبال مندی کا دَور دورہ آیا ہو۔

ترجمانُ القرآن کا

منصبِ رسالت نمبر

اس ضخیم نمبر میں سنت کی آئینی حیثیت پر ڈاکٹر عبدالودود رکن ادارۂ طلوعِ اسلام اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے درمیان جو مراسلت ہوئی تھی اسے یکجا شائع کر دیا گیا ہے علاوہ ازیں جسٹس محمد شفیع (ہائیکورٹ) کے اُس فیصلہ پر بھی مولانا نے تنقید لکھی ہے جو حدیث کے خلاف لکھا گیا ہے۔

اس ضخیم نمبر کے چند پرچے دفتر میں موجود ہیں۔ ضرورت مند حضرات توجہ فرمائیں۔ قیمت ساڑھے تین روپے۔

دو پرچوں کے خریدار کو محصول ڈاک معاف۔

مینجر ترجمان القرآن اچھرہ۔ لاہور